کیے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ صاحب ایمان ہوں، دوسرا یہ کہ اعمال صالحہ سے متصف ہوں، تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنے کے عادی ہوں یعنی ان کے تمام اوقات شعر و شاعری میں نہ گزرتے ہوں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی کرتے ہوں یا ان کی شاعری میں بھی اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے ہو اور چوتھا وصف یہ بیان فرمایا، جو میں سمجھتا ہوں کہ اس استثنا کی اصل علت ہے، کہ ان کی یہ شاعری دفاعی ہو اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کافروں کی جارحانہ شاعری کے جواب میں ہو۔ گویا وہ شاعری جو کفر کے مقابلہ میں ہو۔

حضرات محترم! ان تمام گزارشات کے نتیجہ میں یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میڈیا کی جنگ میں حصہ لینا اور اس مورچہ پر کفار کے حملوں اور جارحیت کا مقابلہ کرنا بھی سنت نبویؐ ہے، اسوہ رسولؐ ہے اور تعامل صحابہؓ ہے اور اس حوالہ سے ہمیں آج کی صورت حال کا ضرور جائزہ لینا چاہیے کہ مغربی میڈیا، جو ایک طاقت ور میڈیا ہے اور ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات و جرائد کے ذریعہ عالمی رائے عامہ پر پوری طرح اثر انداز ہونے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی صلاحیت سے مالا مال ہے، وہ دنیا کو مسلمانوں اور اسلام سے متنفر کرنے کی مہم میں مصروف ہے۔ مغربی میڈیا اسلام اور دیندار مسلمانوں کا جو نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصہ میں اسلام کی بالا دستی قائم ہو گئی اور دیندار مسلمان حکمران بن گئے تو بنیادی حقوق ختم ہو جائیں گے، انسانی آزادیاں چھین لی جائیں گی، ظلم و بربریت کا دور واپس آ جائے گا اور تہذیب و ترقی تباہ ہو جائے گی۔ اسکے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے خاموشی ہے، اس لیے شرعی لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ جدید ترین میڈیا تک رسائی حاصل کی جائے، اس کی تکنیک کو سمجھا جائے اور اس کی زبان میں اس کے الزامات کا جواب دیا جائے، بلکہ آج کی زبان میں جدید ترین ذرائع کو استعمال میں لاتے ہوئے اسلام کا پیغام دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور اس کے احکام و قوانین کو اصلی صورت میں سامنے لایا جائے۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ تعالیٰ نے ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں عربی مدارس کے نصاب کے بارے میں ایک کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

(تمہیدی ارشادات کے بعد): مجھے آپ بزرگوں سے جو کچھ عرض کرنا ہے' ابھی ہوائی جہاز میں راستہ میں آتے ہوئے کوشش کی کہ میں اپنے خیالات میں ترتیب پیدا کروں۔ معاملہ بہت وسیع ہے۔ یہ ایک طول طویل داستان ہے۔ علوم عربیہ کی تعلیم کا مسئلہ' اس کی پچھلی تاریخ' درمیانی عہد کے تغیرات اور اصلاح کی تحریک' اس تحریک کے سلسلے میں جو قدم اٹھائے گئے ہیں ان کی کہانی اور پھر آج جو معاملہ منزل پر پہنچ کر رکا ہوا ہے' اس کی سرگزشت۔ یہ ایک بڑی کہانی ہے۔ نہ تو اس کانفرنس کے حصے میں اتنا وقت آیا ہے جو اس کا متحمل ہوسکتا ہے' اور نہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے جو بہت سے پہلو ہیں' آپ حضرات علم کے سامنے ان کو پیش کر کے وقت کو ضائع کیا جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ جو اہم نکات ہیں' جو اہم پوائنٹس (Points) ہیں' جن پر ہمیں جلد سے جلد پہنچ جانا چاہیے' ان کی طرف آپ دوستوں کی توجہ دلاؤں گا۔ تاہم مشکل یہ ہے کہ وہ داستان ایسی ہے کہ اس کو شروع کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی ابتدائی مقدمہ سامنے لانا پڑتا ہے۔ اور اس لیے چند منٹ ضرور اس میں صرف ہوں گے۔ یہ چیز تو آپ حضرات کے سامنے ہے کہ قدرتی طور سے ہر علم تین مختلف دوروں سے' تین مختلف منزلوں سے گزرتا ہے۔ پہلا دور جو اس کی پیدائش کا ہوتا ہے' جس کو عربی میں کہیں گے تدوین کا دور۔ تو علم کا بحیثیت علم

مدون ہونا' وہ اینٹیں جو فی الواقع متفرق دماغوں میں پڑی تھیں' ان اینٹوں کا ایک کے اوپر ایک رکھا جانا اور ایک دیوار بننا' اس کو کہتے ہیں تدوین۔ تو پہلا دور تو علم کی تدوین کا ہوتا ہے' اس کی بناوٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن اس پر کام ختم نہیں ہو جاتا۔ دیوار چن لی گئی' لیکن ابھی اس کے نقش و نگار بہت کچھ باقی ہیں۔ تب دوسرا دور آتا ہے' جس کو ترقی کی منزل کہنا چاہیے' تنقیح علوم کا۔ پہلا دور تدوین کا ہے' دوسرا دور تہذیب کا ہے۔ اب اس کی کاٹ چھانٹ کرنا' اس کو سنوارنا' اس کو بڑھانا' اس کی نوک و پلک کا بنانا' یہ تہذیب ہے۔ تو قدرتی طور پر پہلے دور کے بعد ہر علم پر دوسرا دور جو گزرتا ہے' وہ اس کی تنقیح و تہذیب کا ہوتا ہے۔ تنقیح کا لفظ زیادہ موزوں نہیں ہے' بلکہ تہذیب کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ تہذیب کے معنی چھانٹنا' سنوارنا ہیں تو دوسرا دور تہذیب کا ہوتا ہے۔ تو اب نہ صرف دیوار بن گئی بلکہ اس دیوار کے نقش و نگار بھی بن گئے' نوک و پلک درست ہوگئے۔ تب تیسرا دور آتا ہے' جس کو کہ آپ بلوغ اور تکمیل کا دور کہتے ہیں۔ یعنی وہی چیز اب اپنے کمال تک پہنچ گئی اور اب اس میں کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ گئی ہے' جس کی نوک و پلک درست کی جائے۔ اب اس کی اشاعت' اس کا پھیلانا اور بڑھانا ہے' درس و تدریس سے اس کو زیادہ استوار کرنا ہے۔ تو تیسرا دور بلوغ و تکمیل کا آتا ہے۔ قدرتی طور پر یہ تین دور اسلامی علوم پر بھی گزرے۔ پہلا دور تدوین کا تھا' دوسرا تہذیب کا اور تیسرا بلوغ و تکمیل کا۔ اگر ان تین دوروں اور زمانوں کی جستجو کی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ تیسری صدی ہجری کا زمانہ تدوین علوم کا زمانہ تھا۔ تیسری صدی ہجری کے بعد سے پانچویں صدی تک کا زمانہ' اگر آپ تاریخ کے اوراق الٹیں گے تو معلوم ہوگا کہ پانچویں صدی کا زمانہ تہذیب علوم کا زمانہ ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر' جو علوم پچھلی تین صدیوں کے اندر مدون ہو چکے تھے' ان کی تہذیب' ان کی مزید نقش آرائی' ان کی ترتیب' یہ داستان ہوئی۔ آپ کو پانچویں صدی ہجری تک نمایاں دکھائی دے گی۔ اس کے بعد کا زمانہ اسلامی علوم کے بلوغ و تکمیل کا اور ان کی اشاعت کا زمانہ تھا۔ یہ' اگر دقت نظر کے ساتھ تاریخ کے صفحات پر نظر ڈالی جائے تو میں سمجھتا ہوں ساتویں صدی ہجری تک پہنچتا ہے۔ یعنی ساتویں صدی ہجری تک' ہم کو ایسے ائمہ فن نظر آتے ہیں جن کا کام اگرچہ بنیادی طور پر نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ علوم کی

تہذیب کا تھا' لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ بہت سے تہذیب کے کام تھے جن کو انہوں نے پورا کیا۔ نام ان کے میری زبان پر ہیں' مگر میں اس کے آگے نہیں بڑھنا چاہتا ہوں' اور اس ٹکڑے کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ساتویں صدی کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اچانک اسلامی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے' ایک نیا ورق الٹتا ہے' اور یکایک آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ پچھلی چند صدیاں جن علوم کی تدوین میں' ان کی تہذیب میں اور ان کی درس و تدریس میں اور بلوغ و تکمیل میں صرف ہوچکی ہیں' اچانک اب ایک نئے دور سے آشنا ہوتی ہیں' اب ایک نئے دور سے دوچار ہوتی ہیں۔ اس دور کو میں دور تنزل اور ذہنی تنزل کا دور قرار دیتا ہوں۔ علم و فن کے ہر گوشے میں یہ چیز آپ کو نظر آئے گی کہ جو درخت تہذیب و تدوین کا پھل پھول رہا تھا' اس کی شاخیں ساتویں صدی تک کمال مرتبہ تک پہنچ گئیں اور بجائے اس کے کہ پھلتا پھولتا' اچانک آپ کو نظر آئے گا کہ اب پت جھڑ شروع ہوگئی اور درخت بڑھنے کی جگہ گھٹ رہا ہے۔ چنانچہ ساتویں ہجری کے بعد اسلامی علوم پر ایک عالمگیر تنزل کا دور شروع ہوگیا۔ سب سے پہلی چیز جو نمایاں نظر آتی ہے' وہ یہ ہے کہ علم کی ترقی کے لیے جو بنیادی چیز ہے' جس کو عربی میں نظر و اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے' اچانک غائب ہو جاتی ہے اور ساتویں صدی کے بعد جمود ہر گوشے پر چھاگیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے کسی علم و فن میں' الا یہ کہ کسی گوشے میں کبھی کبھی کوئی نادر شخصیت پیدا ہوگئی' جیسے علامہ ابن تیمیہ پیدا ہوئے ساتویں صدی ہجری میں' مگر عام رفتار تنزل کی شروع ہو چکی تھی اور اب کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہی کہ علم کے کسی زاویے میں کسی نئے گوشے کو ابھارے۔ اب جو کچھ بھی سرمایہ رہ گیا ہے' وہ یہ ہے کہ جو دیواریں اٹھ چکی ہیں' ان کی لیپا پوتی کی جائے۔ چنانچہ یہ دور وہ پیدا ہوتا ہے' جس کو شروح کا دور کہا جاسکے۔ لیکن اس سے پہلے بھی شرحیں لکھی گئی تھیں جو علمی جگہ رکھتی تھیں' مگر اب دماغی قوت ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ آپ کو معلوم ہوگا کہ بڑے سے بڑے ائمہ فن جو پیدا ہوتے ہیں' ان کی زندگی کن کاموں میں ختم ہوتی ہے؟ وہ تلخیص میں مصروف ہوتے ہیں' وہ خلاصہ کرتے ہیں یا شرح نویسی۔ لیکن کسی علم و فن میں نظر و اجتہاد کے ساتھ قدم اٹھے' یہ چیز ختم ہو چکی تھی۔ اور لازمی طور پر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی

علم و فن کے جو کارخانے قائم ہوئے تھے' وہ ایک بنیادی انقلاب سے زائل ہوگئے اور درس و تدریس بجائے اس کے کہ اس ڈھنگ پر چلے جس ڈھنگ پر چھ صدیوں تک چلا تھا' ایک نیا ڈھنگ شروع ہوگیا۔ یہ ڈھنگ دور تنزل کی پیداوار تھا اور روز بروز یہ تنزل بڑھتا گیا۔ اب یہ جو انقلاب ہوا ہے اس کی تفصیل میں نہ جاؤں گا اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات علم و فضل کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ میں تفصیل میں جاؤں۔ اس تنزل کا نتیجہ جو کچھ نکلا' اس نے علم و فضل کے مختلف صیغوں پر کیا اثر ڈالا' اس کی داستان بہت طول طویل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ایسے ارباب نظر موجود تھے کہ جنھوں نے اس چیز کو محسوس کیا اس چیز کو جسے چھ صدیاں گزرنے کے بعد آج ہم محسوس کر رہے ہیں اور اس پر ہم ماتم کر رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایسی گہری نظریں جو باہر کی تمام سطحوں سے گزر کر حقیقت کے اندرونی گوشوں تک پہنچنے والی تھیں' ایسی نظریں اس وقت پیدا ہوئیں' جنھوں نے اس صدی میں اس حقیقت کو محسوس کیا' جیسے علامہ ابن خلدون۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن خلدون نے یہ حقیقت محسوس کی جیسا کہ اس نے اپنے مقدمے میں اشارہ کیا۔ بہرحال یہ خال خال نظریں تھیں۔ ان کا اثر وقت کی عام رفتار پر نہیں پڑا۔ تنزل کا دور شروع ہو چکا تھا اور وہ برابر آگے بڑھتا گیا۔ اب اس دور میں آ کر ہمیں جو تبدیلیاں معلوم ہوئیں' وہ بھی اتنی مختصر نہیں ہیں کہ میں چند منٹوں میں سمجھانے کی کوشش کر سکوں۔ سب سے بڑا بنیادی انقلاب جو پڑھنے پڑھانے کے طریقے میں ہم کو نظر آتا ہے' وہ یہ ہے کہ اس وقت تک قدما یعنی پچھلوں کے طریقہ تعلیم کا ایک خاص ڈھنگ تھا۔ وہ طریقہ تعلیم آہستہ آہستہ بدلنے لگا۔ ساتویں صدی کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل مبدل ہوگیا۔ متقدمین کے طریقہ تعلیم میں آپ کو معلوم ہے کہ علوم و فنون عالیہ کے درس میں ایک قسم ہے آلات کی اور ایک قسم ہے نفس علوم کی۔ عربی میں دو قسمیں کر دی گئی ہیں۔ ایک ہے فنون آلیہ اور ایک ہے نفس علوم۔ تو پچھلوں کا جو طریقہ تعلیم تھا وہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ طریقہ تھا املا کا۔ املا عربی کی خاص اصطلاح ہے۔ تعلیم کی وجہ سے یہ اصطلاح اس شکل میں ابھری۔ املا کے جو طریقے متقدمین کے تھے' وہ آپ کو معلوم ہے کہ کیا ہوئے؟ آج کچھ کتابوں کی نقل نکل آئی ہے اور اس سے آپ اندازہ کر

سکتے ہیں کہ املا کسے کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً" شریف مرتضیٰ کی کتاب ہے امالی۔ املا کے معنی ٹھیک وہی ہیں، جیسے آج آپ کسی کالج میں چلے جائیں وہاں پروفیسر جس طریقے پر تقریر کرتا ہے، لکچر دیتا ہے، ٹھیک اسی معنی میں املا ہے۔ ایک صاحب علم کوئی خاص کتاب اپنے سامنے نہیں رکھتا تھا۔ وہ بیٹھتا تھا اور طالب علم اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ طالب علم کاغذ رکھ لیتے تھے اور جو موضوع اس کے پیش نظر ہوتا تھا، مثلاً" اس نے علم ادب، حدیث، تفسیر لے لیا، اس کے اوپر وہ زبانی تقریر کرتا تھا اور جو طلاب اس کے حلقہ درس میں بیٹھے ہوتے تھے وہ سنتے تھے اور اس کے نوٹس (Notes) لیتے تھے اور یہ نوٹس جمع کر لیتے تھے۔ جو کتابیں آج آپ کو مل گئی ہیں، مثلاً" قاری کی کتاب، شریف مرتضیٰ کی کتاب، یہ وہی نوٹس ہیں جو لکچر کے وقت مستعد طالب علموں نے لیے ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس طریقہ تعلیم کی بلندی کتنی تھی اور آج کل کا جو موجودہ سسٹم ہے، وہ ٹھیک اس کے مطابق چلتا تھا، لیکن بنیادی فرق آپ کو ساتویں صدی کے بعد نظر آئے گا، اگرچہ یہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور اگر ہم اس کی کھوج میں نکلیں تو معلوم ہوگا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد کا جو زمانہ آتا ہے، تو املا کا طریقہ عربی اور اسلامی مدرسوں میں بالکل مفقود اور ناپید ہوجاتا ہے اور کہیں اس کی پرچھائیں نظر نہیں آتی اور بدقسمتی سے املا کی جگہ کتابیں لے لیتی ہیں۔ یاد رکھیے کہ قدما کے طریقہ تعلیم میں کیا تھا! ان کا اعتماد املا کے اوپر تھا نہ کہ کتابوں کے اوپر۔ حتیٰ کہ اگر میں آپ سے کہوں کہ علوم عالیہ اور صرف و نحو یعنی گرامر ایسی چیز ہے کہ آپ اس کے لیے کہیں گے کہ کتابیں ہونا چاہئیں، آج بھی طریقہ تعلیم یہ ہے کہ ان چیزوں کا دارومدار کتابوں پر ہے، لیکن آپ کو تعجب ہوگا کہ متقدمین اور مسلمانوں کا جو طریقہ رہا تھا، اسلامی علوم اور صرف و نحو اور ادب یا اسی قسم کی جو چیزیں ہیں، اس میں اعتماد املا پر تھا۔ کتابیں بن چکی تھیں، دوسری صدی ہجری سے کتابیں مرتب ہوچکی تھیں، وہ کتابیں اس زمانہ میں مل سکتی تھیں، لیکن اعتماد جو کچھ تھا، وہ املا پر تھا۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی مسافت اس تنزل کے دور میں اسلامی دماغ نے طے کی ہے۔ اس نکتے سے جہاں اعلیٰ علوم کی تعلیم ہی نہیں بلکہ علوم آلیہ یعنی صرف و نحو و گرامر وغیرہ کی تعلیم بھی زبانی درس کے ذریعے سے ہوتی تھی، جس کو املا کہتے ہیں، وہاں سے تنزل کے کارواں

کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ساتویں صدی میں آپ یہاں تک پہنچ گئے۔ جو اعلیٰ علوم ہیں جیسے کہ حدیث، تفسیر اور فلسفہ، ان کی تعلیم تمام تر کتاب پر ہوتی ہے، کتابوں کے ورق پڑھنے والے کے سامنے ہیں اور دماغ کے سارے دروازے جو اس موقع پر کھلنا چاہئیں، ایک صاحب نظر و علم کے، وہ اس موقع پر بند ہوگئے اور قفل چڑھا دیا گیا۔ اس طریقہ تعلیم کو رائج کیا گیا تھا۔ بظاہر آپ کہیں گے کہ یہ ایک نہایت معصوم تبدیلی ہے، جس میں کوئی حرج نہیں، قدما کے پاس اتنی کتابیں کہاں تھیں! قدماء کے پاس یہ عجیب و غریب طریقہ متون و شروح کا کہاں تھا! متن نویسی کا طریقہ نکلا اور شرحیں لکھیں گئیں اور حواشی لکھے گئے۔ یہ تمام سرمایہ پچھلوں کے پاس کہاں تھا! وہ محض تقریر کے ذریعے اپنا کام چلاتے تھے۔ کتابیں بن گئی تھیں۔ وہ مرتب اور مدون ہوگئی تھیں۔ لیکن نہیں۔ کاش معاملہ اس تک ہوتا۔ لیکن معاملہ یہاں تک نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے، اس ظاہری پردے کے پیچھے، ایک بڑی دماغی تبدیلی بیٹھی ہوئی ہے۔ چیز یہ تھی کہ جس علم کو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس علم کے لیے آپ کے دماغ کو کسی ایک معین کتاب کے اوراق میں بند کرنا چاہیے، مقفل کرنا چاہیے یا کہ ایک کتاب سے مدد لیتے ہوئے پڑھنے والے کا دماغ اور پڑھانے والے کا دماغ علم و فن کی وادیوں میں کھلے طور پر پڑھ سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ تعلیم کے لیے ایک خاص حد تک کسی معین کتاب کا رکھنا ضروری ہے۔ وہ پڑھنے والے کو مدد دیتی ہے۔ وہ اس کے دماغ کو عبارت کے حل کرنے کی مشق کراتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر حقیقت اس وقت تک حقیقت ہے، جب تک اعتقاد کے درجے میں ہو۔ وہاں سے جہاں وہ ادھر ادھر ہوئی، اس کے بعد وہ گر گئی۔ یہ چیز اس حد تک صحیح تھی، جس حد تک اسے جانا چاہیے تھا، لیکن جب کتابوں کا راستہ کھل گیا تو اب تمام تر دارومدار ہوگیا کتاب پر۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۲ برس سے ۱۴ برس تک آپ اپنا دماغ صرف کرتے ہیں، مگر نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ مجھے معاف کیا جائے۔ یہ کہنے کی میں جرات کروں کہ چند کتابوں کا علم حاصل ہوجاتا ہے اور علوم حاصل نہیں ہوتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ چند کتابوں کا علم حاصل کرنے میں اور نفس علم حاصل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس تبدیلی سے روز بروز تمام تر اعتماد کتابوں پر ہوتا گیا اور وہ جو پچھلا طریقہ املا کا تھا اور زبانی درس کا تھا وہ

روز بروز ختم ہوتا گیا۔ یہ ایک عجیب مصیبت ہے کہ دنیا ان منزلوں سے گزر چکی اور صدیوں کا فرق ہو گیا۔ آپ کو تعجب ہو گا اگر اب آپ کے سامنے اس چیز کو پیش کروں۔ مثلاً" آپ علم تفسیر کا درس لے رہے ہیں اور آپ کا دارومدار بیضاوی اور جلالین پر ہے۔ کیا ہو گا کہ بیضاوی اور جلالین کی لفظی عبارت' اس کے مرجع اور ضمائر کا علم حاصل ہو جائے گا' نہ کہ علم تفسیر کا' بلکہ اس کی پرچھائیں تک نظر نہ آئے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ درس و تدریس میں علمی قوت کمزور ہوئی۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ میں اس کے پھیلاؤ کو سمیٹ نہیں سکتا۔ اس لیے کچھ چیزیں نظرانداز کرنا پڑیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ روز بروز تعلیم کا ڈھانچہ بگڑتا گیا' تعلیم گرتی گئی۔ ایک بڑی غلط چیز جو پیدا ہوئی' وہ تھا متون و شروح کا حد اعتدال سے آگے بڑھ جانا۔ متن و شرح لکھنے کا طریقہ فی نفسہ صحیح تھا۔ یہ چیز ہر علم و فن میں اور ہر زبان میں اچھی ہوتی ہے' لیکن یہ چیز جب حد سے زائد بڑھ جائے گی تب ظاہر ہے کہ اس سے نفس علم کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ بجائے اس کے آپ کسی علم میں کوئی ایک کتاب نپی تلی زبان میں وضاحت کے ساتھ مرتب کریں اور وہ ایک طالب علم کے آگے رکھیں تاکہ اس کو موقع ملے کہ وہ پورے طور پر اس کتاب پر چھا جائے' آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آپ نے ایک چیز لکھی کہ جس کا نام متن' اور گن گن کر اتنے الفاظ رکھ دیے کہ کم سے کم الفاظ ہوں اور وہ ایک معما اور چیستاں بن سکے۔ جو شرح جو لکھنی چاہیے تو اس شرح میں مبحث آگئے' مثلاً" اس نیک بخت نے ایک متن لکھا اور اس امر کی کوشش کی کہ عبارت کو سخت بنانے میں کوئی بھی دروازہ اور کھڑکی کھلی نہ چھوڑی جائے' جس سے دماغ اپنی راہ پر آ جائے۔ اگر اس کو عبارت میں اشارہ کرنا تھا' تو وہ ان ذریعوں سے کام لیتا۔ اگر وہ ان ذریعوں کو یعنی مرجع اور ضمائر کو اس عبارت میں رکھ دیتا' تو معاملہ صاف ہے۔ مثلاً" اس کو یہ کہنا ہے کہ ایسی صورت میں اس سے نتیجہ یہ نکلے۔ اگر وہاں وہ اس چیز کا نام بھی رکھ دے' تو یہ بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے۔ مگر وہ نیک بخت نہیں رکھتا ہے اور یہ ناممکن ہے۔ اب اس سے ایک اہم بحث پیدا ہوئی کہ "اس سے" جو لفظ آیا ہے' وہ کس طرف جاتا ہے۔ چنانچہ اس پر بحث چلی۔ قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا' تو یہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس سے دماغ کو عبارت کے حل کرنے اور

سمجھنے کی قوت پیدا ہو۔ حل عبارت بہرحال ضروری چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایک طالب علم کے لیے تو یہ بہت ہی ضروری ہے کہ وہ کسی کتاب کو پڑھنے اور اس کی عبارت کو سمجھنے میں اور مباحث کو قابو میں لانے کے لیے اپنے اندر صلاحیت پیدا کر سکے' لیکن اس کے لیے آپ بہت سے طریقے اختیار کر سکتے ہیں' اس کی کیا ضرورت ہے کہ تمام علوم و فنون کی جو آپ تعلیم دیں' ان کی تمام کتابوں کو آپ اسی طریقے سے غارت کریں اور دماغی قوت کا بڑا حصہ اصلی علم کو حاصل نہ کر سکے بلکہ وہ بیکار کی بحث میں خرچ ہو۔ آپ غور کیجئے کہ ایک شخص کو منطق پڑھا رہے ہیں' آپ کے لیے جو چیز ضروری ہے' وہ یہ ہے کہ آپ منطق میں اس شخص کے دماغ میں زیادہ سے زیادہ جو براہ راست رشتہ پیدا کر سکتے ہیں پیدا کریں۔ یہ رشتہ جتنا زیادہ مضبوط ہوگا' اتنا ہی زیادہ دماغ اس کے لیے تیار ہو گا اور لاجک (Logic) کو پکڑ میں لے گا۔ لیکن آپ نے طریقہ کیا اختیار کیا ہے؟ وہ ایک کتاب شروع کرتا ہے۔ اس کے دماغ کی ساری قوت اس کتاب میں صرف ہوتی ہے۔ دماغ کو صرف کیا جاتا ہے منطق کے مبادیات' مسائل' مباحث' مقاصد کے اوپر' کسی چیز پر جو ایک خاص نام کی کتاب ہے' اس کا ایک خاص نام کا مصنف ہے' اس نے ایک متن لکھا ہے' اس کی جو ایک خاص سطر ہے' اس کا کیا مطلب ہے؟ آپ خیال کیجئے کہ اس کے اصلی موضوع سے' آپ اس کے دماغ کو بھٹکا کر' کہاں سے کہاں لے گئے! یہ سب کچھ آپ اس لیے کر رہے ہیں کہ عبارت کے حل کرنے کی اسے مشق ہو۔ مگر یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ آپ اس کے دماغ کو غارت کرتے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ہر علم کے لیے گرامر بہت زیادہ ضروری ہے اور بیک وقت آپ دو بوجھ اس پر لادتے ہیں' اور ہندوستان میں تین بوجھ۔ پہلا بوجھ ہے اصل علم کا' دوسرا حل عبارت کا۔ اس کی ساری قوت عبارت کے حل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دماغ کی پکڑ میں چیز نہیں آتی ہے۔ پھر آپ شکایت کرتے ہیں کہ لوگ کوڑھ مغز ہیں لیکن جو طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے' وہ ان کو کوڑھ مغز بنانے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ میں اس چیز میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ طریقہ درس میں جو تبدیلی ہوئی' اس سے اسلامی علوم کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ قدما کے طریقہ املا کو ترک کر دیا۔ اعلیٰ علوم کی تعلیم زبانی درس کے ذریعے سے اور لکچرس

(Lectures) سے دی جاتی تھی' یہ بالکل ناپید ہوگیا اور تمام تر کتابوں پر اعتماد ہو گیا۔ اور جو طریقہ اختیار کیا گیا' وہ اصولی تعلیم کے لحاظ سے بالکل غلط طریقہ اختیار کیا گیا۔ اب اس سلسلے میں جو بہت سی چیزیں ہیں' ان سب کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی' آپ سب حضرات علم و فضل کی موجودگی میں۔ برسوں سے میرا خیال یہ ہے' تیس برس سے میرا خیال ہے کہ علامہ تفتا زانی ایک غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے اور تیس برس سے میری یہ رائے ہے کہ انھوں نے جو متن و شرح لکھے وہ ان کی زندگی میں بہت مقبول تھے اور ان کے علم و فضل کا سکہ سب پر جما ہوا تھا اور جو چیز ان کے قلم سے نکلتی تھی' وہ تمام ملک میں چھا جاتی تھی اور بعض تصنیفات ان کی زندگی میں داخل درس ہوگئیں اور آج تک ہم سب منت گزار ہیں' ان کی تصنیفات کے۔ کوئی صاحب یہاں پر ایسے نہ ہونگے جنھوں نے علامہ موصوف کی تصنیفات نہ پڑھی ہوں۔ علامہ تفتازانی کی کتابوں کی مقبولیت اس زمانے میں اس لیے ہونے لگی تھی کہ اسلامی علوم کا دماغی تنزل شروع ہو چکا تھا اور ترقی کا دور ختم ہوگیا تھا اور ان کتابوں سے بجائے اس کے کہ آگے چل کر ترقی کے دروازے کھلے ہوں' ایک حد تک نقصان پہنچا۔ یہ میں ڈرتے ڈرتے ایک لفظ آپ حضرات سے کہہ رہا ہوں' تاکہ آپ حضرات کو گراں نہ گزرے۔ یہ بھی میرا عقیدہ کہ ادب عربی اور عربی بلاغت کو مطول نے سخت نقصان پہنچایا۔ قدما کی کتابیں نکل آئی ہیں' جیسے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغت۔ اس کے علاوہ اور بھی چیزیں نکل آئی ہیں' جن سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلاغت عربی کی تعلیم کہاں تک تھی۔ ہم بد قسمتی سے کہاں سے گر کر کہاں آگئے۔ جرجانی کی تصنیفات کو چھوڑ دیجئے۔ سکاکی اس دور کی پیداوار تھا۔ دراصل ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا' اس نے مفتاح لکھی۔ کاش وہ اصلی شکل میں رہتی' لیکن نہیں رکھی گئی۔ بہرحال یہ داستان طولانی ہے۔ میں جس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں' وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں ایک بنیادی تبدیلی ہوئی اور اس نے اسلامی علوم اور اس کی بنیاد کو ہلا دیا۔ اس سلسلے میں یہ بات آپ یاد رکھیے کہ ترقی اور تنزل کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ کتنی کھلی ہوئی اس تنزل کی باتیں ہوں یا ترقی کی باتیں ہوں' ان کو آپ یا آپ کا زمانہ فوراً" نہیں پکڑ سکتا۔ ترقی اور تنزل حقیقتاً" دونوں بڑی دھیمی چال چلتے ہیں۔ ایسی دھیمی چال چلتے ہیں

کہ آپ کو پتا ہی نہیں چلتا کہ کوئی چل رہا ہے۔ لیکن کافی وقت گزر جاتا ہے اور کافی مسافت جب زمانہ طے کرلیتا ہے' تب آپ چونکتے ہیں' مورخ چونکتا ہے' اور لکھتا ہے کہ حقیقت یہاں سے یہاں آگئی۔ لیکن وہ اچانک نہیں آئی ہے۔ پچاس ساٹھ یا سو برس میں یہاں آئی ہے۔ لیکن اس سو برس میں اس کی چال اتنی دھیمی تھی کہ اس چال کو کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا۔ منٹوں کو آپ پکڑ سکتے ہیں' گھنٹوں کو آپ پکڑسکتے ہیں کیونکہ ساٹھ منٹ کا گھنٹہ ہوتا ہے' مگر اس کو آپ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کی چال اتنی دھیمی ہے کہ اس کو آپ کی آنکھ بھی نہیں پکڑ سکتی۔ اسی طرح دنیا کی تمام حقیقتیں دھیمی چال چلتی ہیں اور یہ دھیمی چال پکڑ میں نہیں آتی ہے۔ جب زمانہ بہت کافی مسافت طے کرلیتا ہے اور جب ایک نقطے کو چھوڑ کر دوسرے نقطے تک پہنچتا ہے تب آپ چونکتے ہیں کہ کتنی مسافت طے کرلی' تو اس طریقہ پر دماغی ترقی اور تنزل کا افسانہ ہے۔ ترقی شروع ہوتی ہے' تو کوئی مورخ اس کو پکڑ نہیں سکتا کہ فلاں سنہ' فلاں برس یہ ترقی شروع ہوئی یا بجائے اس کے تنزل کے کارواں کا سفر شروع ہو جاتا ہے' لیکن آنکھ اس کو پکڑ نہیں سکتی کہ وہ بتلا سکے کہ فلاں سنہ میں اتنے بجے اسلامی علوم کے کارواں کے تنزل کا سفر شروع ہوا۔ لیکن وہ چیز شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایک لمبی مسافت طے کرلیتی ہے' تب مورخ کا قلم آشنا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر آپ کوشش کریں گے کہ ساتویں صدی ہجری کا زمانہ تخمینا" مقرر کر دیا ہے' تو ساتویں صدی ہجری کے بعد دماغی تنزل کا زمانہ کھلے طور پر کھڑا ہر جگہ نظر آجائے۔ تنزل اس طرح شروع نہیں ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ اس نے سر اٹھایا اور ساری نگاہوں نے دیکھ لیا کہ وہ تنزل کھڑا ہے۔ وہ تو اس طرح آتا ہے کہ لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کے میدان میں ہیں مگر آہستہ آہستہ اپنا کام کرتا جاتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ساتویں صدی ہجری میں اسلامی اور عربی علوم کے مدارس آباد ہیں' ہر جگہ علما و فضلا درس دے رہے ہیں' جن کے حلقہ درس سے سیکڑوں عالم و فاضل فیضیاب ہو کر زندگی کے بلند سے بلند مرتبے تک پہنچتے ہیں' لیکن تنزل کے کارواں کا جو بیج تھا وہ زمین پکڑ چکا تھا اور اس نے اپنے برگ و بار پیدا کرنا شروع کر دیے تھے اب کافی وقت تھا کہ وہ درخت جو پیدا ہوا تھا' وہ جب اس حد تک پہنچا اور بلند ہوا تو اس کی پھیلی ہوئی شاخیں ہر ایک کو نظر آنے

لگیں۔ اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں' تو یہ بنیادی حقیقت سامنے ابھرے گی۔ میں اس چیز کی طرف آپ کی توجہ دلا رہا تھا کہ ساتویں صدی ہجری کے بعد اسلامی علوم کے تنزل کا دور شروع ہوا۔ اب جب ہم نے اس زمانے کو ایک حد تک معین کر لیا' تو ہمارے لیے یہ چیز صاف ہو گئی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے درس و تدریس کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا' تو وہ کس خمیر سے پیدا ہوا تھا۔ ترقی کے خمیر سے یا تنزل کے خمیر سے۔ ہندوستان میں اول ہی روز سے اسلامی علوم کے درس و تدریس کی بنیاد جو قائم ہوئی تھی' وہ تنزل کے دور کا نتیجہ تھی' ترقی کے دور کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے خمیر میں تنزل کا مواد موجود تھا۔ ساتویں صدی ہجری سے پہلے اسلامی علوم کی ترقی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ چھٹی صدی میں تاتاریوں کی بغاوت' خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتل عام' ان تمام چیزوں کا جو عالمگیر اثر پڑا علوم اسلامیہ نیز ان کی دماغی اور علمی حالت پر' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر گوشے میں خرابیاں پیدا ہوئیں اور قدرتی طور سے یہ جو ایک گوشہ تھا درس و تدریس علوم کا' وہ بھی اس سے متاثر ہوا۔ لیکن بہرحال اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہیے۔ لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اب موجودہ حالت میں جو معاملہ ہمارے پاس موجود ہے' اس کو کس شکل میں حل کرنا چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد وہاں تک پہنچوں۔ یہ چیز کہ جس ڈھنگ پر اسلامی اور عربی علوم کا طریقہ سلسلہ جاری ہے' اس میں اصلاح ہونا چاہئے۔ موجودہ زمانے میں اس کا احساس کب شروع ہوا' یہ بھی کہنا مشکل ہے۔ لیکن میری نظر سے جو چیز گزری ہے' اس کو میں یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ شاید سب سے پہلے ایک شخص بیرن توسی نے انیسویں صدی میں ممالک اسلامیہ کا سفر کیا اور گیارہ جلدوں میں اپنا سفر نامہ مرتب کیا اور خاص اہتمام سے اسے مصر میں چھپوایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ دور کو آپ لے لیں۔ اس صدی میں ایک مسیحی عالم یہ کہتے ہوئے نظر آتا ہے کہ جن طریقوں پر اسلامی اور عربی علوم کا ڈھانچہ چل رہا ہے وہ کامیاب نہیں ہے۔ یہ عالم بیرن توسی ہے۔ اس کے بعد پھر جو شخص اس کے خلاف پوری قوت سے اٹھا وہ مرحوم شیخ عبدہ تھا۔ یہ جب مصر سے جلا وطن کیے گئے تو بیروت گئے اور پھر سید جمال الدین سے مل کر بیروت میں ۱۸۹۲ء میں ایک لائحہ' ایک اسکیم (Scheme) تیار کی اور یہ مرتب کر کے ترکی کے شیخ الاسلام کے پاس بھیجی'

ان کا خیال ہوا کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے' اور اگر اس مسئلے کو چھیڑا جاسکتا ہے' تو اس کے لیے شیخ الاسلام موزوں ہیں کہ وہ اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کا جو سلسلہ اس وقت قائم ہے' وہ غلط ہے' اور اس سے امید نہیں ہے کہ صحیح نتائج پیدا ہوسکیں۔ اس لیے اس میں اصلاح ہونا چاہیے اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ترکی کے شیخ الاسلام ایک نیا مدرسہ اور کالج قسطنطنیہ یا استنبول میں قائم کریں۔ چنانچہ شیخ رشید رضا کے مضامین میں یہ اسکیم موجود ہے۔ یہ نہایت قیمتی تحریک تھی۔ لیکن اس کو اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ شیخ محمد عبدہ کے خط کا کوئی جواب دیا جائے اور ظاہر ہے کہ ترکی میں یہ سلسلہ جس شکل میں قائم تھا اور جو لوگ اس عہدے پر مقرر کیے جاتے تھے' ان سے کسی تبدیلی کی امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن وہ اسکیم ایک قیمتی چیز ہے۔ اس کے بعد سید جمال الدین نے عربی میں ایک اخبار نکالا جس کا نام "العروۃ الوثقیٰ" تھا۔ ۱۴ نمبر اس اخبار کے نکلے۔ یہ اخبار پیرس سے نکلتا تھا۔ مہینے میں دو نمبر نکلتے تھے۔ حقیقتاً یہ ایک انقلاب انگیز چیز تھی۔ وہ اسکیم اس اخبار میں بھی شائع ہوئی۔ عربی بولنے والی دنیا پر اس اخبار نے اس سکیم نے ایک انقلاب انگیز اثر ڈالا۔ بہر حال وہ مضامین کتاب کی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک سے زیادہ مضامین شیخ محمد عبدہ نے اس موضوع پر لکھے' مگر ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

آج جب ہم اس وقت لکھنؤ میں اکٹھا ہوئے ہیں' اس کی یاد دلانا بہت آسان ہے۔ اگر اس مسئلے کو کسی انجمن نے پوری قوت کے ساتھ اٹھایا تو وہ ندوۃ العلما تھا۔ ندوۃ العلما کے مدرسے کا قیام ۱۳۱۱ھ میں ہوا بلکہ اس کے بعد ندوۃ العلما علم کی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور آج بھی وہ بہت سے امتیازات رکھتا ہے۔ ندوۃ العلما نے پوری قوت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھایا جس میں ارباب فہم حضرات موجود تھے جو اس مسئلے کی گہرائی کو سمجھ سکتے تھے۔ ندوۃ العلما نے اپنا بنیادی مقصد اصلاح نصاب تعلیم قرار دیا تھا' مگر میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا' اس کے مختلف وجوہ تھے کہ ندوۃ العلما اس معاملے میں قدم آگے نہ بڑھا سکا اور یہ گتھی سلجھ نہ سکی اور ابھی تک الجھی ہوئی ہے۔ حالانکہ بار ہا ندوۃ العلما نے اس سلسلہ میں جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں' وہ ہمیشہ اس مسئلے کو سلجھانے میں مدد دیں گی۔ مجھے

بہت جلد اپنی داستان کو ختم کرنا ہے۔ جہاں تک اس چیز کا تعلق ہے کہ عربی اور اسلامی علوم کی تعلیم جس ڈھنگ پر دی جارہی ہے' اس کی اصلاح ہو' اس کے بارے میں اہم اور بنیادی چیزیں کہی گئی ہیں۔ وہ چیزیں سرسری طور پر ہمارے سامنے ہیں۔ ایک 'دو' تین چار' پانچ۔ اور اس کے بعد ہم کو موقع ملے گا کہ ہم غور کر سکیں کہ کیا واقعی ان اصلاحوں کی ضرورت ہے! کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ جو حضرات مسلمانوں کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں' اسلامی علوم کی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں' وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں؟ ان کی ذمہ داریاں بہت ہیں۔ وہ نہ صرف ملک کے سامنے بلکہ تمام عالم اسلام کے آگے جوابدہ ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور اس عظیم الشان خدمت کو انجام دیں! اس خواب کو جو سو برس سے لوگوں نے دیکھا ہے اور جو آج تک شرمندہ تعبیر نہیں ہوا ہے' کم ازکم آج تو اس کی تعبیر عالم اسلام کے سامنے آئے۔ اس سلسلے میں اس پر غور کرنا چاہیے کہ جو طریقے اصلاح کے ہیں' ان کی اہم باتیں کیا ہیں اور مہمات کیا ہیں۔ سب سے پہلی چیز مختصر میں آپ سے کہوں گا کہ وہ فنون آلیہ کے متعلق ہے۔ میں نے فنون آلیہ کے متعلق آپ سے کہا۔ وہ فن خود مقصود نہ ہو' بلکہ وسیلہ ہو کچھ ایسی چیزوں کا جو مقصود ہوں' تو اس لیے وہ بھی ضروری ہو گئے۔ کچھ چیزیں تو بطور وسیلے کے ہیں اور کچھ چیزیں بطور مقصود کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی' علم و نظر کے کسی صیغے میں کہ ہم وسیلے کو مقصد بنا دیں۔ بد قسمتی یہ ہے کہ ہر گوشے میں سب سے پہلی ٹھوکر جو انسانی دماغ لیتا ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو اس نے بطور وسیلے کے پکڑا تھا' اس نے اسے مقصود بنا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و حقیقت کے ہر صیغے میں ہم مقصد سے اتنا دور جا پڑے ہیں کہ ہم کسی حالت میں بھی اس کے نزدیک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں دیکھنا یہ ہے کہ کون سی چیز وسیلہ ہے اور کون سی چیز مقصود ہے۔ اگر ہم نے وسیلہ کو مقصود بنا لیا اور اسی وسیلہ کو سمجھ لیا کہ یہ ہمارا مقصود ہے' تب ہم نے شیرازے کو درہم برہم کر دیا۔ تو اس کو ڈھونڈنا پڑے گا کہ وہ فنون آلیہ کون کون ہیں! صرف ونحو (گرامر)۔ تو صرف و نحو ایک بنیادی چیز ہے کہ جس کے بغیر عربی زبان کو ہم نہیں سیکھ سکتے ہیں۔ آپ جس چیز کو ڈھونڈنے نکلے ہیں' عربی گرامر

نہیں ہے'بلکہ وہ اسلامی علوم و فنون ہیں جو صندوق میں بند ہیں اور ان پر قفل چڑھا ہوا ہے۔ آپ کو کنجی کی تلاش ہے۔ جو چیز آپ کو ڈھونڈنا ہے اور جو صندوق کے اندر ہے' اس کو بغیر کنجی کے آپ نہیں پا سکتے اور صرف و نحو وہ کنجی ہے جس سے اس صندوق کا قفل کھل سکتا ہے۔ اس طرح علم ادب' عربی علم ادب ہے۔ جب تک آپ کی قابلیت پورے طور پر نہیں ہوتی ہے اور وہ قابلیت صحت کے ساتھ پیداہوتی ہے' اس وقت تک آپ اپنے مقصود سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ اس طریقے سے لاجک (Logic) اور منطق بھی ضروری ہے۔ منطق بجائے خود مقصود نہیں ہے۔ اصلی مقصد تو آپ کا ہے کسی نتیجے تک پہنچنا' کسی بحث کو اس طریقے سے ترتیب دینا کہ صحیح نتیجے تک آپ پہنچیں۔ یہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہو سکتی' جس کی آپ کو ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ منطق بھی بہرحال وسیلہ ہوئی اور مقصود نہیں ہوئی اور وہ فنون آلیہ میں داخل ہوئی۔ آپ کو توجہ دلاؤں گا کہ اگر آپ تھوڑی دور تک بھی میرے ساتھ چلیں' میں زیادہ دور تک آپ کو لے جانے کی ہمت نہیں کروں گا' چند قدم آپ میرے ساتھ چلیں' اور مجھے یقین ہے کہ آپ میری طرح مطمئن ہو جائیں گے کہ ان فنون آلیہ کی تعلیم جو ہمارے مدرسوں میں دی جا رہی ہے' وہ صحیح نہیں ہے اور جو کام تھوڑے وقت میں کیا جاتا ہے' اس کام کو ہم زیادہ وقت میں کر رہے ہیں اور بہتر نتیجہ نہیں نکل رہا ہے' تو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ابھی میں نے آپ سے کہا تھا کہ طالبعلموں پر دوسری جگہ دو بوجھ ڈالے جاتے ہیں' مگر ہمارے یہاں ہندستان میں طالب علم پر بیک وقت تین پڑ رہے ہیں۔ یہ سب سے پہلی بات جو میں آپ کو یاد دلاؤں گا' وہ یہ ہے کہ نہ عربی ہماری مادری زبان ہے اور نہ فارسی ہماری مادری زبان ہے۔ جو طالب علم تیار کیا جاتا ہے اس کے سامنے اجنبی زبانیں ہوتی ہیں اور اس کو ایک لمبی چوڑی مسافت عربی زبان میں طے کرنا پڑتی ہے۔ آپ ایک طالب علم کو ایک مدرسے میں بٹھاتے ہیں اور اس کے سامنے عربی کتابیں رکھتے ہیں۔ آپ یہ چیز محسوس نہیں کرتے ہیں کہ عربی زبان میں آپ نے اس کے اوپر ایک وقت میں تین بوجھ ڈالے۔ پہلا بوجھ خود عربی زبان کا ہے۔ دوسرا بوجھ کتاب کا اور جو اس میں عبارت لکھی گئی ہے اور تیسرا بوجھ یہ کہ اس زبان کو سیکھے' جو اس کی مادری زبان نہیں ہے آپ کو معلوم ہے کہ ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا

کہ عربی صرف و نحو اور گرامر' میزان اور منشعب سے شروع ہوتی تھی اور صرف میر اور نحو میر پڑھائی جاتی تھی۔ یہ کتابیں جس زمانے کے لیے لکھی گئی تھیں' اس زمانے کے لیے صحیح تھیں کیونکہ فارسی زبان اس زمانے میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے' یہاں فارسی اجنبی زبان ہے۔ ہندوستان میں کبھی ایسا دور نہیں گذرا کہ فارسی مادری زبان ہوئی ہو۔ لیکن اس میں شبہ نہیں ہے کہ فارسی زبان کی تعلیم اتنی عام تھی کہ لوگوں کو اس سے توحش نہ تھا۔ اس لیے عربی صرف و نحو کی کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

جو چیز میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں' وہ ایک گہری چیز ہے۔ مگر بہت صاف ہے اور وہ بغیر کسی کد و کاوش کے آپ کے سامنے ابھر آئے گی۔ ایک شخص عربی زبان سے نا آشنا ہے۔ایک بچہ آٹھ برس کا عربی زبان کو شروع کرتا ہے۔ آپ میزان اور منشعب سے شروع کراتے ہیں۔ فارسی زبان اس کے لیے اجنبی زبان ہے' اس کی مادری زبان اردو ہے۔ آپ ایک ہی وقت میں اس پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ پہلا بوجھ یہ ہے کہ وہ فارسی عبارت کو حل کرے' جو اس کے لیے بالکل بیگانہ زبان ہے۔ دوسرا بوجھ یہ ہے کہ وہ کتابیں اور وہ رسائل اس ڈھنگ پر لکھے گئے ہیں کہ فن تعلیم کے لحاظ سے جو سہل آسان اور سمویا ہوا ڈھنگ ہونا چاہئے' اس ڈھنگ پر وہ نہیں لکھے گئے۔ تیسرا بوجھ ہے عربی صرف و نحو کے سمجھنے کا۔ تو اب آپ غور کیجئے کہ اس کا دماغ ایک ہی وقت میں آپ کتنی قوتوں میں ضائع کر رہے ہیں۔ اس کی ساری دماغی قوت تین خانوں میں بٹ رہی ہے۔ فارسی زبان کا سمجھنا' عبارت کا حل کرنا اور عربی گرامر یعنی صرف و نحو کے مسائل کو سمجھنا اور حل کرنا ہے۔ ان تینوں خانوں میں اس کا دماغ بٹ جاتا ہے۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ اس کا دماغ ایک ہی چیز میں صرف ہوتا یعنی صرف و نحو حاصل کرنا۔ تو کیا وہ عربی زبان کے صرف و نحو کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ اپنے دماغ میں جگہ نہ دیتا؟ اور عربی زبان کا صرف و نحو اس کے دماغ میں راسخ نہ ہوجاتا؟ لیکن آپ ایک ہی وقت میں اس کے دماغ پر تین بوجھ ڈالتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی دماغی قوت منتشر ہو جاتی ہے اور جو چیز آپ اس کو سکھا رہے ہیں یعنی صرف و نحو اس کی دماغی قوت اس کو مرکز بنا کر سامنے نہیں رکھتی۔ دماغ

سکتا ہے۔ چونکہ فارسی ایک اجنبی زبان ہے۔ فارسی کی عبارت کا مطلب اول سمجھے۔ عبارت پیچیدہ ہے' اس کے حل کرنے میں اسے دقت ہوتی ہے اور عربی صرف و نحو کے حاصل کرنے میں مزید مشکل پڑتی ہے۔ بہرحال اب مجھے جلد ختم کرنا ہے۔ ایک بنیادی غلطی جو عربی تعلیم میں ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس چیز کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی ہے کہ اگر ہم اصلاح چاہتے ہیں' تو بہرحال ہمیں تسلیم کرنا ہے کہ ہندوستان میں عربی علم اور تعلیم میں جس فن کی تعلیم بھی شروع کی جائے' اس کی پہلی رونمائی مادری زبان میں ہونا چاہیے' تاکہ وہ اس کو فوراً پکڑ لے اور اگر پہلی رونمائی مادری زبان میں نہیں ہوتی ہے اور ایک اجنبی روپ اس کے سامنے آتا ہے' جسے وہ پہچانتا نہیں ہے' تو پھر کافی وقت اس کے دماغ کو لگ جاتا ہے کہ وہ اپنے دماغ کو اس اجنبی صورت سے آشنا کرے۔ آپ اس کو فارسی پڑھانا چاہتے ہیں اس کی کیا ضرورت ہے کہ عربی صرف و نحو کی تعلیم کے پیچ و خم سے اس کے دماغ کو متوحش کریں۔ بلکہ بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہر فن کی ابتدائی رونمائی مادری زبان میں ہوا کرے۔ کوئی علم جو اس کے سامنے آئے' پہلی مرتبہ جو اپنا گھونگھٹ ہٹائے اپنے چہرہ سے' تو وہ یہ سمجھے کہ یہ جانی بوجھی ہوئی صورت ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ عربی کے صرف و نحو کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیے۔ اسی طرح سے منطق کی پہلی کتاب اردو میں ہونی چاہیے۔ اس طریقے سے جتنے فنون آلیہ ہیں' ان کی پہلی کتاب مادری زبان میں ہونی چاہئے' تاکہ بیک وقت حل زبان' حل عبارت' حل موضوع کا بوجھ اس کے اوپر نہ پڑے۔ اس میں بھی بال و پر ہیں' مگر میں اس کو ختم کرتا ہوں۔

دوسری چیز جس کی تفصیل میں میں نہ جاؤں گا' وہ متون و شروح کی بابت ہے۔ اس کا طریقہ حد اعتدال سے گزر گیا۔ جس حد تک یہ معاملہ پہنچ گیا ہے' وہ ہماری تعلیمی قوت کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ تو بہرحال یہ چیز بھی پیش نظر رکھیے۔ ایک اور اہم چیز یہ ہے کہ متون و شروح کے جو طریقے اختیار کیے گئے ہیں' ان میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔

تیسری چیز جو آپ سے میں کہوں گا' وہ یہ ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی وجہ سے ہندوستان میں عربی علم و ادب کی تعلیم ہمیشہ کمزور رہی۔ آپ کو معلوم ہے کہ عربی علم و ادب میں اسلامی علوم کا خزانہ مدفون ہے اور بغیر اس سے آشنا ہوئے ہم اسلامی علوم سے

آشنا نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں ادب عربی کی تعلیم کا سلسلہ ہمیشہ کمزور رہا ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ایک ہزار برس کی زندگی میں' جو یہاں اسلامی علوم کو آئے ہوئے ہوگئے' اگر آپ معلوم کرنا چاہیں کہ کون کون اشخاص ایسے پیدا ہوئے ' جن کو یہ قدرت تھی کہ وہ ایک عرب کی طرح سلیس اور فصیح عربی لکھ سکیں! جتنے اشخاص پیدا ہوئے ہیں' میں ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گن سکتا ہوں' اور پانچوں انگلیوں کا شمار نہیں ختم ہوگا کہ نام ختم ہو جائیں گے۔ یہ چیز ہمیشہ کمزور رہی۔ اس کے کیا اسباب تھے؟ آپ اگر اس میں جائیں گے' تو یہ ایک بڑی داستان معلوم ہوگی۔ اس داستان کا ایک حصہ اس بنیادی غلطی پر مبنی ہے جو اس کے بارے میں ہوئی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک چیز فن بدیع ہے اور ایک فن کتابت۔ یہ کتنی بڑی بنیادی غلطی تھی کہ لوگوں نے فن بدیع اور فن کتابت میں فرق نہیں کیا۔ بدیع کیا ہے' یہ آپ سے کہنے کی ضرورت نہیں' جہاں جدید تعلیم یافتہ احباب موجود ہیں۔ فن بدیع ایک طرح کی صنعت گری ہے' جو ابھرتی ہے تنزل کے زمانے میں۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ لفظوں کا گورکھ دھندا بنانے میں بڑے سے بڑا کمال دکھایا جاتا ہے۔ ہر زبان میں پہلا دور معانی کا دور ہوتا ہے۔ اس کے بعد جو لوگ آئیں گے' تو محسوس کریں گے کہ معانی کی جھولی خالی ہو چکی ہے۔ لہٰذا وہ لفظوں کے گورکھ دھندے میں پھنس جائیں گے۔ اگر گرمی کا لفظ پہلے مصرع میں آیا' تو سردی کا لفظ دوسرے مصرع میں آنا ضروری ہے۔ اس طرح کی جو لفظی کاریگریاں ہیں' ان کو عربی میں کہتے ہیں فن بدیع۔ یہ تو آپ سمجھ گئے کہ فن بدیع یعنی لفظی صنعت گری کا فن' یہ ایک الگ چیز ہے' اس کو آپ نثر میں لا سکتے ہیں اور نظم میں بھی۔ صحیح ادبی ڈھنگ پر لکھنا' یہ چیز ہے فن کتابت۔ کتابت میں اگر آپ فن بدیع کو جوڑ دیں گے' تو وہ کتابت نہیں رہے گی اور یہ لفظوں کی صنعت گری' لفظوں کا گورکھ دھندا اور کتابت کا معما اور چیستان اور تماشا بن جائے گا' لیکن فن کتابت نہ ہوگی۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ فن بدیع کا زیادہ تعلق نثر سے ہے۔ یہ چیز وہ ہے جو عربی میں نثر سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے مقامات کا طریقہ کہہ سکتے ہیں اور اس کے لکھنے والے کو اصحاب مقامات کہتے ہیں۔ مثلاً" حریری کے مقامات' بدیع الزمان کے مقامات۔ بہرحال یہ فن بدیع میں لکھے گئے تھے اور ان کی وجہ سے ان کی شہرت ہوئی۔ لیکن خود

حریری اور بدیع الزمان کے ذہن میں ایک منٹ کے لیے بھی یہ بات نہیں آئی کہ کوئی زمانہ لفظی صنعت گری کا ایسا آئے گا کہ وہ فن کتابت کا نمونہ سمجھا جائے گا۔ لیکن ہندوستان میں عربی کی تعلیم کا جب خیال پیدا ہوا' تو مقامات حریری طالبعلموں کے سامنے رکھ دیئے گئے۔ خدارا انصاف کیجئے کہ فن کتابت سے اس کا کیا تعلق ہے اور کیا اس کو درس میں رکھ کر آپ نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ عربی میں اونچی سے اونچی ترقی جو ہوسکتی ہے' وہ یہ ہے؟ اس طرح سے آپ طالب علم کا وقت خراب کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنا تک نہیں آتا ہے۔ لیکن کوشش یہ کی جاتی ہے کہ اس کے سامنے نمونہ فن بدیع کا رکھا جائے' لفظی کاریگری کا جس کا کتابت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر آپ ایک صفحہ لکھیں جس میں قاف (ق) کا لفظ نہ آئے یا ایسا صفحہ لکھیں کہ جس میں ہر لفظ میں یا ہر سطر میں قاف (ق) آئے' اگر آپ کی عمر کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے' تو کیجئے' چشم ماروشن دل ماشاد۔ لیکن آپ نمونہ خطوط لکھنے کا نہیں بناسکتے ہیں۔ اگر ایک شخص کو خط لکھنا ہے جس میں کہ (ص) نہ آئے' (ب) نہ آئے' اگر اس طریقہ سے کوئی خط لکھنے لگے گا' تو اس کو لوگ مجنون سمجھنے لگیں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ فن بدیع الگ ہے اور فن کتابت الگ ہے۔

حضرات! مجھے معاف کیا جائے۔ ۱۴ یا ۱۵ برس تک لڑکے پڑھتے ہیں اور دس سطریں عربی کی صلاحیت کے ساتھ نہیں لکھ سکتے' اگر لکھیں گے تو ایسی عربی ہوگی' جس کو ایک عرب پہچان نہ سکے گا۔ تو یہ ایک بہت بڑا نقص ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ ضرورت ہے کہ عربی کی تعلیم کی نیو نئے سرے سے قائم کریں۔ بہترین کتابیں موجود ہیں' بہترین مواد موجود ہے' ایسی کتابیں موجود ہیں کہ عربی ادب کے معجزات میں جن کا شمار ہو سکے۔ مقامات قطعاً" درس میں داخل نہ ہونا چاہیے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسی اہم چیز کی طرف آتے ہوئے مجھے دیر لگ گئی۔ بہرحال یہ معاملہ اتنا اہم ہے اور اتنا کم وقت مجھے ملا' جس کا مجھے افسوس ہے۔ لیکن زیادہ سے زیادہ زور جواب میرے دماغ میں باقی ہے وہ میں کوشش کروں گا کہ اس میں صرف ہو۔

حضرات! اب میں آتا ہوں معقولات پر۔ آپ کی تعلیم کا بہت بڑا حصہ ان چیزوں پر مشتمل ہے جن کو عام بول چال میں معقولات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاں تک درس

نظامیہ کا تعلق ہے' اول روز سے اس کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ زیادہ سے زیادہ عنصر معقولات کا رکھا جائے۔ خود ملا نظام الدین نے جو کتابیں رکھی ہیں' وہ محدود تھیں۔ ہمارے درس نظامیہ میں معقولات کا عنصر بہت چھا گیا ہے۔ اب میں اس کی مقدار کے متعلق آپ کو متوجہ نہیں کرنا چاہتا۔ بہرحال میں اس چیز کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۴۷ء میں کیا ایسا وقت نہیں آیا ہے کہ آپ اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ جو حقیقت آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے دنیا نے تسلیم کر لی تھی' کب تک آپ اس سے انکار کرتے رہیں گے؟ کب تک آپ اس کو جھٹلائیں گے؟ کیا آپ نے اس کو محسوس کیا ہے کہ دنیا کہاں جا رہی ہے اور اب کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے! میں نے بھی پھٹی ہوئی چٹائیوں پر بیٹھ کر ان کتابوں کو پڑھا ہے اور میری ابتدائی تعلیم کا وہ سرمایہ ہیں۔ ایک منٹ کے لیے بھی میرے اندر مخالفت کا خیال نہیں پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اس بارے میں میرا دل زخمی ہے۔ یہ معاملہ تو ایسا تھا کہ آج سے ایک سو برس پہلے ہم نے اس چیز کو محسوس کیا ہوتا اور اس حقیقت کو تسلیم کیا ہوتا کہ اب دنیا کہاں سے کہاں آگئی ہے اور اس کے بارے میں کیا تبدیلی ہمیں کرنا ہے۔ لیکن اگر سو برس پہلے ہم نے تبدیلی نہیں کی' تو کم از کم یہ تبدیلی ہم کو پچاس برس پہلے کرنا چاہیے تھی۔ لیکن آج ۱۹۴۷ء میں اپنے مدرسوں میں جن چیزوں کو ہم معقولات کے نام سے پڑھا رہے ہیں' وہ وہی چیزیں ہیں' جن سے دنیا کا دماغی کارواں دو سو برس پہلے گزر چکا۔ آج ان کی دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر میں اس معاملے کی تفصیل میں جاؤں اور میں آپ کو توجہ دلاؤں' تو کم از کم تین چار گھنٹے چاہیے ہیں کہ حقیقتاً" معاملات کی نوعیت کیا ہے! لیکن میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم جس زمانہ میں ندوۃ العلما قائم ہوا تھا' آج سے چالیس برس پہلے' اس وقت شاید یہ دقتیں ہوں' لیکن اب یہ حقیقت اتنی کھل چکی ہے کہ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ جہاں تک معقولات کا تعلق ہے' آپ اس حقیقت پر غور کریں کہ معقولات کا جو کچھ ذخیرہ ہے' وہ سب بے کار ہے۔ سوائے اس کے کہ دماغ کو اس سے بیکار کریں اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ بہرحال اب میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا' لیکن اس پر توجہ دلاؤں گا کہ اس میں شک نہیں ہے کہ فلسفہ اور تاریخ میں ایک عہد متوسط ہے اور آج کل کی بول چال

میں فلسفہ تاریخ کے جو خاص حصے کیے گئے ہیں' اس میں ایک زمانہ ہے' دور وسطیٰ کا۔ یہ درمیانی عہد حقیقتاً" ایک کڑی ہے' جو یونانی فلسفے کو موجودہ زمانے کے فلسفے سے قریب کرتی ہے اور یہ کڑی دراصل عربوں کا فلسفہ ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ عربوں نے اپنے فلسفیانہ جدوجہد کے زمانہ میں جو یادگاریں چھوڑی ہیں' وہ فلسفہ کے مختلف صیغوں پر چھائی ہوئی ہیں۔ کہ ان کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ یونان نے' ہندوستان نے معاملات کو جس حد تک پہنچایا تھا' اب اس کے بعد عربوں نے آج کل کے فلسفہ کو جس جگہ پہنچایا' اس کے بیچ کی ایک جگہ ہے۔ پچھلی جگہ سے ہٹتی ہوئی' آنے والی جگہ سے جڑتی ہوئی' یہ عربوں کا فلسفہ ہے۔ اگر یہ کڑی بیچ کی نہ ہوتی' تو شاید نئے دور میں جو اٹھان ہوئی ہے' وہ اٹھان اس شکل میں نہ ہوتی۔ بہرحال یہ وہ دور ہے' جسے موجودہ زمانے کے لوگوں نے تسلیم کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نہایت عظیم اور بلند چیز ہے۔ لیکن وہ اس لیے نہیں ہے کہ اس فلسفہ کی تعلیم میں وقت صرف کریں اور فائدہ اٹھائیں۔ وہ ایک قیمتی میراث ہے اور ہمارا فرض ہے کہ اس کو محفوظ رکھیں' اس کی بلندی اور عظمت کو نمایاں رکھیں۔ اس لیے زمانے کو اس کی ضرورت ہے کہ کوئی ایک کتاب تو ایسی ہو کہ جس سے اہل علم کو معلوم ہو سکے کہ فلسفہ عربوں نے جو یونانیوں سے لیا' اس کو انھوں نے کس طریقہ سے محفوظ رکھا اور آنے والی نسلوں تک پہنچایا۔ نیز اس کے مباحث میں انھوں نے کتنے نئے قدم اٹھائے۔ بلاشبہ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ضرور ہونا چاہیے کہ جس کے ذریعہ سے ہم اس چیز کو محفوظ رکھ سکیں۔ آج جو طریقہ ہے فلسفہ کا' مثلاً" انھوں نے گریک فلسفہ کو لیا' یونانی فلسفہ کو لیا' اس کے خاص مسائل پر روشنی ڈالی' بیچ کا جو دور آیا اس کی کہانی سنائی۔ اس کے بعد ماڈرن زمانہ آیا جسے عہد حاضر کہتے ہیں۔ اب یہ دماغ اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس کے آگے جو ایک تصویر آجاتی ہے فلسفہ کے مختلف عہدوں کی' مختلف دوروں کی' وہ اس کے لیے کفایت کرتا ہے کہ دماغ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اب ہمیں کوئی نہ کوئی چیز اس طریقے کی رکھنا ہے کہ جو قدیم ذخیرہ موجود ہے' اس کو ہم پورے طور پر محفوظ رکھ سکیں اور نمایاں رکھیں' کہ ایک طالب علم جو ہمارے مدرسے میں آیا ہے' وہ اس سے بے خبر نہ رہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی ضرورت ہے کہ یہ حقیقت مان لی جائے کہ دراصل جو فلسفہ آپ کو

پڑھانا ہے' وہ مختلف مسائل ہیں جو کہ اس وقت منقح ہو چکے ہیں۔ اگر یہ چیز آپ نہیں کرتے تو میں آپ سے کہوں گا کہ آپ زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔ بلکہ آپ زمانے سے لڑ رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ تاریخ کی ایک لمبی چوڑی داستان ہمارے سامنے ہے' جو ہم کو یقین دلاتی ہے کہ قدامت پرستی نے جب ہتھیار اٹھایا' تو نتیجہ یہ نکلا کہ کش مکش ہوئی۔ مگر اس کشمکش کا یہ نتیجہ نکلا کہ قدامت پرستی کو ہارنا پڑا اور وقت کو جیتنا پڑا۔ اب اس کشمکش کی عمر بڑھ سکتی ہے' لیکن آخر میں ہار ہی ماننا پڑے گی' قدامت پرستی کو' تو اس سلسلے میں جیسا میں نے کہا کہ آپ وقت سے لڑ نہیں سکتے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے اتنی لمبی چوڑی کہانی سنائی اور یہ کہہ دیا کہ ساتویں صدی کے بعد سے جو دور رہا' وہ تنزل کا دور رہا' لیکن اس ساتویں صدی کے بعد یہی مدرسے تھے' یہی تعلیم گاہیں تھیں' اور یہی نصاب تعلیم تھا' یہی پڑھانے والے تھے' جن سے ایسے لوگ پیدا ہوئے' جن کی قابلیت کا یہ حال تھا کہ علوم و فنون تو چھوڑ دیجئے ملک کے انتظام کی باگ دوڑ ان کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اگر یہ تعلیم کا طریقہ غلط تھا' تو کیونکر ممکن تھا کہ اس کے پڑھے ہوئے ایسا انقلاب پیدا کر سکتے اور شہنشاہی امور میں اونچے سے اونچے عہدہ پر پہنچ سکتے۔ ابوالفضل اور فیضی کہاں کے پڑھے ہوئے تھے۔ نظام الملک طوسی کہاں کے پڑھے ہوئے تھے! یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے ملک کے انتظام کی باگیں اپنے ہاتھ میں لیں اور اپنے نقوش اور یادگار ہمیشہ کے لیے چھوڑے۔ آپ کو معلوم ہے کہ زمین کی پیمائش اور اس کے بندوبست کا خیال اور بندوبست کے لفظ کی اصطلاح' آپ کو معلوم ہے کہ بنیادی طور پر بندوبست آج بھی ان ہی کھمبوں پر قائم ہے' جن کھمبوں پر اکبر کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔ پہلی بنیاد تو شیر شاہ کے زمانے میں پڑی۔ لیکن اکبر کے زمانے میں اس کی تنقیح کی گئی اور ٹوڈر مل نے اس کو مکمل کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نقشہ کس نے بنایا تھا! حکیم فتح اللہ شیرازی ایک شخص تھا' وہ شیراز کا ایک پروفیسر تھا۔ وہ ہندوستان آیا' اکبر کے زمانے میں۔ یہ پیمائش کا معاملہ اس کے سپرد کیا گیا۔ فتح اللہ نے ایک رسالہ اس کے اوپر لکھا اور راجہ ٹوڈر مل سے مل کر اس کام کو انجام دیا۔ آخر یہی تو تعلیم تھی جس تعلیم سے ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ نہ صرف علوم و فنون کے سیغے میں' بلکہ ملک کے انتظامی معاملات میں بھی ان کا ہمیشہ دخل رہا۔ آج

میں کہوں گا کہ کسی اونچے عہدے پر کسی مولوی کو رکھ دیجئے تو لوگ ہمیں پریشان کریں گے، لیکن یہی مولوی تھے، جن کے ہاتھ میں سول (Civil) اور دیوانی کے انتظامات تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، وہی لوگ تھے جو ان ہی مدرسوں سے تعلیم حاصل کر کے آتے تھے۔ اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، وہ پاٹھ شالاؤں کے پڑھے ہوئے تھے۔ مگر ایک چیز آپ بھول گئے۔ وہ چیز ہے تعلیم اور وقت اور زندگی کی چال کے متعلق کوئی تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی، اگر وہ وقت اور زندگی کی چال کے ساتھ نہ ہو۔ جو تعلیم ہو وہ ایسی ہونی چاہئے کہ زمانہ کی جو چال ہے، وہ اس کے ساتھ جڑ سکتی ہو۔ اگر آپ دونوں ٹکڑوں کو الگ الگ رکھیں گے، تو وہ تعلیم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ یہی عربی کی اور فارسی کی تعلیم تھی، لیکن اس وقت زمانہ ۱۹۴۷ء کا نہ تھا۔ اس تعلیم میں اور وقت میں رشتہ تھا، دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان مدرسوں سے جولوگ پیدا ہوئے، زمانہ ان کا استقبال کرتا تھا۔ بہر طور وہ زمانہ گزر گیا، لیکن اس کے بعد کیا ہوا کہ زمانہ تو اپنی پوری تیز رفتاری کے ساتھ چلتا رہا اور آپ وہیں بیٹھے رہے۔ آپ ان ہی مدرسوں میں بیٹھے رہے، جن مدرسوں میں آپ نے آج سے پانچ سو برس پہلے قدم رکھا تھا۔ اس پانچ سو برس کے اندر دنیا بیٹھی نہیں رہی۔ زمانہ بھی چلتا رہا۔ وہ پانچ سو برس کی مسافت طے کر چکا ہے اور آپ وہی کے وہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج جو تعلیم آپ ان مدرسوں میں دے رہے ہیں، آپ وقت کی چال سے اسے کیسے جوڑ سکتے ہیں؟ نہیں جوڑ سکتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ میں اور آپ میں ایک اونچی دیوار کھڑی ہوگئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ تعلیم کہ جس تعلیم سے ملک کے بہترین مدبر، ملک کے بہترین منتظم اور ملک کے بہترین عہدہ دار پیدا ہوتے تھے، آج ان ہی مدرسوں کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ یہ لوگ بالکل نکمے ہیں، ان مدرسوں سے نکلنے کے بعد مسجدوں میں بیٹھ کر یہ لوگ بس خیرات کی روٹیاں توڑ لیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں، انھوں نے حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، لیکن ہمیں یہ ماننا پڑیگا اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہم زمانے سے دور ہو گئے ہیں۔ میرے پاس ایک بہت ہی نچی تلی بہتر طریقے سے لکھی ہوئی ایک تحریر آئی کہ چونکہ آپ گورنمنٹ آف انڈیا کے صیغہ تعلیم میں موجود ہیں، تو کیا یہ توقع کی جائے کہ جو عربی